اِشارات

ہر ذاتِ متصف کے لئے اپنے اتصاف کی حیثیت سے دو کمال ہوا کرتے ہیں۔ ایک کمال تو یہ ہے کہ وہ جس صفت سے متصف ہے اس میں اتصاف کی انتہا کو پہنچ جائے۔ دوسرے یہ کہ اس کی ذات میں وہ صفت اتنی شدید ہو جائے کہ وہ دوسری ذوات تک متعدی ہو اور دوسروں کو بھی اسی صفت کے رنگ میں رنگ دے۔ برف کا کمال اول یہ ہے کہ وہ خود انتہا درجہ کی سرد ہے۔ اور کمال ثانی یہ کہ وہ دوسری چیزوں کو بھی سرد کر دیتی ہے۔ آگ کا کمال اول یہ ہے کہ وہ خود انتہا درجہ کی گرم ہے۔ اور کمال ثانی یہ کہ وہ آس پاس کی چیزوں کو بھی اپنی اسی کیفیت سے متکیف کر دیتی ہے۔ بالکل یہی حال نیکی اور بدی کا بھی ہے۔ نیک آدمی کا پہلا کمال یہ ہے کہ وہ خود نیکی کا مجسمہ بن جائے۔ اور دوسرا کمال یہ کہ وہ اپنے اثر سے دوسروں کو بھی نیک بنا دے۔ اسی طرح برے آدمی کا پہلا کمال یہ ہے کہ وہ خود بدی کی صفت سے بدرجۂ اتم متصف ہو۔ اور دوسرا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی اس بدی کو دوسروں تک متعدی کر دے۔

اس قاعدہ کلیہ کے مطابق کافر اور مومن کے لئے بھی کمال کے دو مرتبے ہیں۔ کافر اگر بجائے خود اپنے عقیدۂ کفر میں راسخ اور مضبوط ہو تو وہ کمال کفر کے پہلے مرتبے میں ہے۔ اور اگر وہ کفر کی تبلیغ کرے، لوگوں کو راہ حق سے روک کر باطل کی طرف کھینچ لانے کی کوشش کرے، اور اپنے زور بیان، یا زور مال یا زور شمشیر یا کسی دوسرے زور سے کفر کی اشاعت کرے، تو وہ کمال کفر کے دوسرے مرتبہ کی بھی تحصیل کر لیتا ہے، اور ان دونوں مرتبوں کو

جمع کرنے کے بعد اس کے لئے کمال کا کوئی اور درجہ باقی نہیں رہ جاتا۔ اسی طرح مومن اگر خود اپنے عقیدۂ ایمان میں راسخ، اور اطاعت حق میں کامل ہو تو وہ کمالِ ایمان کے پہلے مرتبہ پر فائز ہو گا۔ اور اگر اس میں یہ صفت اتنی شدید ہو جائے کہ وہ دوسروں میں بھی ایمان اور اطاعتِ حق کی تبلیغ واشاعت کرنے لگے، اور دوسرے بندگانِ خدا کو بھی اپنی زبان یا اپنے قلم، یا اپنے روپیہ یا اپنے دست و بازو یا اپنے اور وسائل سے ایمان واسلام کے دائرہ میں لانے کی کوشش کرے، تو اس کو کمال ایمان کا دوسرا درجہ بھی حاصل ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد وہ پورا مومن کہلائے جانے کا مستحق ہو گا۔

اس مضمون کو سورۂ آل عمران کے دسویں اور گیارہویں اور بارہویں رکوع میں بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ پہلے فرمایا:۔

قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللّٰهِ۔ (اے محمدؐ ان سے) کہو کہ اے اہل کتاب تم کیوں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو؟

پھر فرمایا:۔

قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا۔ کہو کہ اے اہل کتاب تم کیوں ایمان لانے والوں کو اللہ کے راستے سے روکتے اور اس راہ کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہو؟

یہ دونوں آیات صاف طور پر دلالت کرتی ہیں کہ کفر کا پہلا کمال، آیات آلٰہی کا خود منکر ہونا ہے اور دوسرا کمال اس کفر کی اشاعت کرنا، اور لوگوں کو خدا کے سیدھے رستے سے روکنا، اور اعتقاد و عمل کے ٹیڑھے راستے ان کے سامنے پیش کرنا ہے۔

اس کے بعد مومنوں سے خطاب شروع ہوتا ہے، اور ان سے بھی دو باتیں کہی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ:۔

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے

وَلَا تَمُوتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

کا حق ہے، اور تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔ اور سب کے سب مل کر اللہ کی رسی کو پکڑے رہو اور پراگندہ نہ ہو جاؤ۔

دوسرے یہ کہ :۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو نیکی کی طرف بلاتی ہو اچھے کام کا حکم دیتی ہو اور بُرے کام سے روکتی ہو۔ اور فلاح پانے والے ایسے ہی لوگ ہیں

یہاں ایمان کے بھی دو درجے بتائے ہیں۔ پہلا درجہ تو یہ ہے کہ مومن خود اللہ سے ڈرنے والا ہو، اور مرتے دم تک اوامر الٰہی کا مطیع رہے، اور اللہ کی رسی کو مضبوط تھامے رکھے۔ اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ اپنے دوسرے ابنائے نوع کو بھی نیکی کی طرف بلائے، اچھے کاموں کا حکم دے اور بُرے کاموں سے روکے۔

پھر کمال ثانی کے اندر بھی بہت سے مراتب ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ موم بتی، بجلی کا قمقمہ، چاند اور سورج، سب پر منیر اور روشن گر ہونے کا اطلاق ہوتا ہے، مگر روشن گری میں ان کے مدارج متفاوت ہیں۔ موم بتی صرف ایک حجرے کو روشن کر سکتی ہے، بجلی کے قمقمے کی روشنی ایک بڑے مکان کی حد تک پھیل سکتی ہے، چاند کی روشنی زمین اور اس کے اردگرد کی فضا تک محدود ہے۔ مگر سورج تمام عالم کو اپنی روشنی سے چمکا رہا ہے اور ہمارا پورا نظام شمسی اس کی روشنیوں سے منور ہے۔ اسی طرح مومن اپنے جیسے ایک انسان کے دل میں بھی ایمان کی شمع روشن کر دے تو وہ کمال ثانی کے مرتبہ میں داخل ہو جائیگا لیکن یہ اس کمال کا پہلا درجہ ہوگا پھر ایک جماعت، ایک قوم، ایک ملک میں دعوت الی الخیر کے مدارج ہیں۔ اور آخری درجہ یہ ہے کہ اس کی دعوت الی الخیر تمام عالم انسانی کے لئے عام ہو۔ وہ ساری دنیا کو نیکی کی طرف بلائے۔

پورے ربع مسکوں میں اللہ کا فوجدار بن جائے، بدی اور منکر جہاں بھی ہو اس کے استیصال کے لئے آستین چڑھائے۔ اور اپنے آپ کو کسی خاص برادری کسی خاص قوم، کسی خاص ملک، اور کسی خاص نسلی یا جغرافی حد کے اندر محدود نہ سمجھے۔ یہ کمال ایمان کا سب سے بڑا اور سب سے اونچا درجہ ہے۔ اور چونکہ حضرت حق جل مجدہ نے ہر معاملے میں مسلمانوں کے سامنے ایک بلند مطمح نظر پیش فرمایا ہے۔ اور کسی جگہ پست حوصلگی کی تعلیم نہیں دی ہے۔ اس لئے آگے چل کر بارہویں رکوع میں، ان کو بتایا ہے کہ تم کمال ایمان کے اسی آخری درجہ تک پہنچنے کے لئے ہو:۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (۳: ۱۲)۔

تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے نکالا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو۔ بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

آیت۔ وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ ..... الخ کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے۔ اور اس اختلاف کا منشا لفظ مِنكُمْ ہے ایک گروہ کہتا ہے کہ مِن یہاں تبعیض کے لئے نہیں بلکہ تبیین کے لئے آیا ہے، اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نہیں وہ تبعیض ہی کے لئے آیا ہے۔

پہلے گروہ کا استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب کیا ہے جیسا کہ فرمایا كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ... الخ اور حقیقت میں ہر مکلف ہستی پر واجب ہے کہ وہ نیکی کا حکم دے اور بدی کو دفع کرے، خواہ ہاتھ سے کرے یا زبان سے کرے یا اور کچھ نہ ہو سکے تو قلب ہی سے کرے۔ لہذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ "تم ایسی امت ہو جاؤ جو خیر کی طرف بلاتی، اور برائی سے روکتی ہو"۔ کیونکہ من یہاں تبیین کے لئے ہے،۔ اور اس کی مثال یہ آیت ہے کہ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ (یعنی بتوں کی گندگی سے بچو نہ یہ کہ بتوں میں سے اس چیز سے بچو جو گندگی ہے)۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ مِن یہاں تبعیض کے لئے آیا ہے، اور اس کے دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمانوں میں ایک بڑا حصہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور مریضوں پر مشتمل ہے جو دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے واجبات ادا نہیں کر سکتا۔ دوسرے یہ کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے کچھ شرائط ہیں جو ہر شخص میں نہیں پائی جاتیں۔ اس کے لئے خیر اور معروف اور منکر کا صحیح علم درکار ہے۔ اس کے لئے حکمت اور عقل کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے لازم ہے کہ آدمی پہلے خود کمال درجہ کا متقی اور پرہیز گار ہو، تب لوگوں کو تقویٰ اور پرہیز گاری کی دعوت دے۔ (دیکھو مفاتیح الغیب للامام الرازی، وغرایب القرآن للنیسابوری، انوار التنزیل للبیضاوی)۔

مگر کتاب اللہ اور سنت رسولؐ میں تامل کرنے سے یہ اختلاف بآسانی دور ہو سکتا ہے۔

ہم نے اوپر کلام اللہ سے مومن کے لئے دو کمال ثابت کئے ہیں۔ ان میں سے پہلا کمال یعنی خوف خدا اور اوامر الٰہیہ کے آگے سر جھکا دینا، اور اللہ کی رسی کو مضبوط تھامے رہنا، تو ذات مومن کے ساتھ صفت ایمان کے نفس قیام کے لئے ضروری ہے۔ لہٰذا ہر مومن میں اس کمال کے کسی نہ کسی مرتبہ کا متحقق ہونا لابد ہے کہ اگر وہ اس میں متحقق نہ ہو تو وہ مومن ہی نہ ہو گا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اگر چراغ میں روشنی نہ ہو تو وہ چراغ ہی نہ ہو گا۔ اگر برف میں سردی نہ ہو تو وہ برف ہی نہ ہوگی۔ اگر آگ میں گرمی نہ ہو تو وہ آگ ہی نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے تمام مومنوں کو خطاب کر کے پورے زور کے ساتھ فرمایا ہے کہ اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ اور وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ اور وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ اس آیت میں تبعیض کا نام و نشان تک نہیں ہے بلکہ عموم کے ساتھ تاکید ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسلمان میں لازمی طور پر یہ صفات ہونی چاہییں۔

رہا دوسرا کمال تو وہ کمال زاید ہے جس کا متحقق ہونا، مومن کے مومن ہونے کے لئے نہیں، بلکہ اس کے کمال و تکمیل اور بلند مرتبہ و عالیشان مومن ہونے کے لئے ضروری ہے۔ اب اس کمال کے اعتبار سے ایک قوم کی دو ہی حالتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک حالت تو یہ ہے کہ پوری قوم کی قوم اس صفت کی حامل اور اس مرتبہ کمال پر فائز ہو۔ اور دوسری حالت یہ ہے کہ قوم کے کم از کم ایک حصہ میں کمال ایمان کا یہ اعلیٰ مرتبہ متحقق ہو۔ اور باقی افراد صرف کمال اول سے متصف رہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم پہلی حالت میں ہو یعنی اگر تمہاری پوری قوم دنیا میں آفتاب ہدایت بن جائے، اور تمام اقوام عالم کو نیکی کا حکم دینے والی اور بدی سے روکنے والی ہو تو تم دنیا کی بہترین امت ہوگے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ۔ لیکن اگر تم میں اس اعلیٰ مرتبہ کی ہمت نہ ہو اور پوری قوم اس صفت سے متصف نہ ہو سکے، تو تمہارے اندر کم از کم ایک گروہ تو ایسا رہنا ہی چاہیے جو خیر کی طرف بلاتا رہے۔ اور بدی سے روکتا رہے۔ وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ الخ اسی لئے پہلی آیت میں عموم ہے مگر تاکید نہیں۔ اور دوسری آیت میں تاکید ہے مگر عموم نہیں:

کمال ایمان کے یہ دو درجے، جن کا بار بار ذکر آ رہا ہے۔ صرف اعتبار میں دو ہیں ورنہ حقیقت میں تو دونوں ایک ہی ہیں جس شخص کے دل میں ایمان راسخ موجود ہوگا، اور جو اللہ سے ایسا ڈرنے والا ہوگا جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے، اس کے لئے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی کو گمراہی میں مبتلا دیکھے اور اسے راہ حق کی طرف دعوت نہ دے کہیں بدی کا وجود پائے اور اس کو مٹانے کی کوشش نہ کرے۔ طبیعت مومن کی مثال ایسی ہے جیسے مشک کہ رائحہ ایمان اس کے جرم تک محدود نہیں رہتی بلکہ پھیلتی ہے۔ جہاں تک پھیلنے کا اس کو موقع ملے۔ یا چراغ کہ نور ایمان سے جہاں وہ منور ہوا، اور اس نے آس پاس کی فضا میں اپنی شعاعیں پھیلا دیں مشک میں جب تک خوشبو رہے گی۔ وہ مشام جان کو معطر کرتا رہے گا۔ چراغ جب تک روشن رہے گا۔ روشن کرتا رہے گا

مگر جب مشک کی خوشبو قریب سے قریب سونگھنے والے کو بھی محسوس نہ ہو، اور چراغ کی روشنی اپنے قریب ترین ماحول کو بھی روشن نہ کرے تو ہر شخص یہی حکم لگائے گا کہ مشک مشک نہیں رہا۔ اور چراغ اپنی چراغیت کھو چکا ہے یہی حال مومن کا ہے، کہ اگر وہ خیر کی طرف دعوت نہ دے نیکی کا حکم نہ دے، بدی کو برداشت کرے اور اس سے روکے نہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں خوف خدا کی آگ سرد پڑ گئی ہے اور ایمان کی روشنی مدھم ہو گئی ہے۔

اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "کہ تم میں سے جو کوئی بدی کو دیکھے تو لازم ہے کہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے۔ اور اگر استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان ہی سے سہی، اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو کم از کم دل میں اس کو برا سمجھے اور اس کے مٹانے کی خواہش رکھے، کیونکہ یہ ایمان کا کم سے کم درجہ ہے"۔ اور اسی لئے قرآن مجید میں مومنوں کی عام صفات میں سے ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ نیکی کا حکم دینے والے اور بدی سے روکنے والے ہیں۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (۹ : ۹)۔	مومن مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے حامی اور مددگار ہیں۔ وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں۔ اور بدی سے روکتے ہیں
اَلتَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ الْحَامِدُوْنَ السَّائِحُوْنَ الرَّاكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ	وہ توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، خدا کی حمد کرنے والے، خدا کی راہ میں سفر کرنے والے، رکوع وسجود کرنے والے نیکی کا حکم دینے والے بدی سے روکنے والے اور حدود الٰہی کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

(۹: ۱۲)

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (۲۲ : ۶)	یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم نے ان کو زمین میں طاقت بخش دی تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

پھر جب کہ مومن کی ضروری صفات میں سے ایک صفت امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس کی حیثیت فرض کفایہ کی سی رکھی گئی، اور اس معاملہ میں اتنی نرمی کی گئی کہ مسلمانوں کی پوری قوم میں سے صرف ایک جماعت کا آمر بالمعروف اور ناھی عن المنکر ہونا کافی سمجھا گیا ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا علیم و خبیر کو معلوم تھا کہ عہد رسالت کے گذر جانے کے بعد مسلمانوں کے ایمان ضعیف تر ہوتے چلے جائیں گے۔ جوں جوں زمانہ گذرتا جائیگا یہ قوم مائل تنزل ہوتی جائے گی حتیٰ کہ ایک وقت وہ آئے گا کہ کروڑوں مسلمان دنیا میں موجود ہوں گے مگر ان کی شمع ایمان میں اتنی روشنی بھی نہ ہوگی کہ اپنے قریبی ماحول ہی کو منور کر سکیں، بلکہ ظلمت کفر کے غلبہ سے خود ان کے اپنے نور کے بجھ جانے کا خوف ہوگا۔ لہذا ایسی حالتوں کے لئے اس نے فرمایا کہ تمہارے اندر کم از کم ایک ایسی جماعت تو ضرور ہی موجود رہنی چاہئے جو خیر کی طرف دعوت دینے والی، اور بدی کا مقابلہ کرنے والی ہو۔ کیونکہ اگر تمہارے اندر ایسی ایک جماعت بھی نہ رہے تو پھر تم کو عذاب آلہی، اور قطعی ہلاکت و تباہی سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔

اس مضمون کو قرآن مجید میں خوب کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے

لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ۔ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ	بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا تھا ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی یہ اس لئے کہ انہوں نے سرکشی کی اور وہ حد سے گذر جاتے تھے۔

كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (۵: ۱۱)

ایک دوسرے کو ان بری باتوں سے نہ روکتے تھے جو وہ کیا کرتے تھے۔ اور یہ بہت بری بات تھی جو وہ کرتے تھے

دوسری جگہ فرمایا:۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ (۱۱: ۱۰)

تم سے پہلے کی قوموں میں کچھ لوگ ایسے کیوں نہ ہوئے جو زمین میں فساد پھیلانے سے روکتے۔ ان میں ایسے لوگ اگر تھے بھی تو وہ بہت کم تھے سو ان کو ہم نے نجات دیدی۔ باقی رہے ظالم لوگ تو وہ مجرم تھے تو اے نبی تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو یونہی ظلم سے ہلاک کر دے، درانحالیکہ ان کے باشندے نیکوکار ہوں

اس مضمون کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی بیان فرمایا ہے کہ:۔

إن الله لا يعذب العامة بعمل خاصة حتى يروا المنكر بين ظهرانيهم وهم قادرون على أن ينكروه فلا ينكروه فاذا فعلوا ذلك عذب الله الخاصة والعامة (رواه احمد)

اللہ عام لوگوں کو خاص لوگوں کے برے اعمال کی سزا نہیں دیتا جبتک کہ نوبت یہاں تک نہ پہنچ جائے کہ وہ اپنے سامنے برے کام ہوتے دیکھیں، اور ان کو روکنے کی قدرت رکھتے ہوں اور پھر نہ روکیں۔ جب وہ ایسا کرنے لگتے ہیں تو اللہ خاص اور عام سب پر عذاب نازل کرتا ہے۔

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:۔

والذی نفسی بیدہ لتامرن بالمعروف

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم

ولتنھن عن المنکر ولتاخذن علی یدالمسیٔ ولتطرنہ علی الحق اطراً اولیضربن اللہ قلوب بعضکم علی بعض اولیلعنکم کما لعنھم۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجہ باختلاف قلیل)۔

لازم ہے کہ نیکی کا حکم دو، بدی سے روکو، اور بدکار کا ہاتھ پکڑ لو اور اسے حق کی طرف موڑ دو ورنہ اللہ تمہارے دلوں کی برائیاں ایک دوسرے پر مسلط کر دیگا۔ یا تم پر اس طرح لعنت کرے گا۔ جس طرح کفار بنی اسرائیل پر کی۔

پس یہ بات واضح ہوگئی کہ آیت و لتکن منکم امۃٌ ... الخ میں جو تبعیض ہے، وہ اس معنی میں نہیں ہے کہ مسلمانوں میں سے صرف ایک ہی ایسی جماعت مطلوب ہے جو داعی الی الخیر اور آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر ہو۔ اور باقی مسلمانوں کے لئے اس خدمت کا بجا لانا واجب نہیں ہے بلکہ دراصل اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں میں کم از کم ایک جماعت تو ایسی ضرور ہی رہنی چاہئے جو خیر کی شمع روشن رکھے اور شر کی ظلمت کو دفع کرتی رہے اگر ایسی ایک جماعت بھی ان میں موجود نہ رہی تو خیر امت ہونا تو درکنار اس قوم کا عذاب آلہی اور لعنت خداوندی سے بچ جانا بھی محال ہے۔

افسوس ہے کہ اس مرتبہ جگہ کی قلت کے باعث شیخ عبدالعزیز شاویش کے خطبات کا سلسلہ رک گیا شاید آیندہ اشاعت میں اس کے لئے جگہ نکالی جا سکے۔